یومِ اقبالؒ ۱۹۸۱ء پر خطاب

احترامِ آدمیّت

دنیا میں کوئی کسی کا محتاج نہ ہو

پرویز

باسمہٖ تعالیٰ

خطاب بتقریب یومِ اقبالؒ

(۲۴ اپریل ۱۹۸۱ء)

کس نگردد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں این است وبس!

پرویز

عزیزانِ گرامی قدر! سلام ورحمت!

جو حضرات میرے ہفتہ واری درسِ قرآن مجید میں شریک ہوتے ہیں، یا جن کی نگاہوں سے میری تحریریں گزرتی ہیں، وہ جانتے ہیں کہ میں کس طرح قرآنی حقائق کی تشریح و تفہیم، کلامِ اقبالؒ سے کرتا ہوں۔ اس سے جہاں قرآنی معارف وضاحت سے سامنے آجاتے ہیں، وہاں خود اقبالؒ کا شعر بھی فلک بوس بلندیوں تک جا پہنچتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو اقبالؒ کا احسان حدود فراموش ہو جاتا ہے۔ عالمگیر انسانیت پر احسان اس اعتبار سے کہ اس وقت اقوامِ عالم جن زہرہ گداز مصائب اور اضطراب انگیز آلام کا شکار ہو رہی ہیں، اُس نے انہیں ان سے نجات حاصل کرنے کا راستہ بتایا۔ ملّتِ اسلامیہ ہندیہ پر اس کا یہ احسان کہ اس نے، ان کے لئے ایک ایسی آزاد مملکت کی نشاندہی کی جس میں وہ اقدارِ خداوندی کے مطابق نظام قائم کر کے صحیح آزادی حاصل کرسکیں۔ اور پھر ان کا احسانِ عظیم اس ہیچمدان پر کہ جس کی قرآن فہمی کا طریق فکرِ اقبالؒ کا رہینِ منّت ہے۔ یہی ہے احساناتِ اقبالؒ کی وہ سہ گونہ اہمیت جس کی یاد تازہ کرنے کے لئے میں ایسی تقاریب پر خصوصی خطاب پیش کیا کرتا ہوں۔

جیسا کہ آپ نے اعلان میں دیکھ لیا ہوگا، میرے آج کے خصوصی درس کا موضوع ہے:

کس نگردد در جہاں محتاجِ کس　　نکتۂ شرعِ مبیں این است وبس!

یعنی اسلام کا ملخص اور شریعتِ قرآنیہ کا منتہیٰ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے۔

اقبالؒ نے ان دو چھوٹے چھوٹے مصرعوں میں، اسلام کے مقصود و منتہیٰ کو سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ قرآن کریم کا اعلان ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ ... (۱۷/۷۰)۔ خدا نے ہر انسان کو، محض انسان ہونے کی جہت سے

واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ آپ دیکھئے! اس میں کافر و مومن کی تمیز و تفریق نہیں۔ (یہ تفریق آگے جا کر شروع ہوتی ہے) اس لئے ہر انسان کو واجب التکریم قرار دیا ہے۔ اور یہی (شرف و تکریم انسانیت) پیغامِ اقبالؒ کا بھی منتہیٰ ہے ؎

برتر از گردوں مقامِ آدم است اصلِ تہذیب، احترامِ آدم است

اس، مقصود و مطلوب پیامِ خداوندی کے بعد، اقبالؒ نے بتایا ہے کہ انسان کو اس عزت و تکریم سے محروم کس طرح کیا جاتا ہے۔ اس نے (بصیرتِ قرآنی کی روشنی میں) کہا ہے کہ مستبد قوتیں سامانِ رزق کو اپنے قبضے میں لے کر، کمزور انسانوں کو ضروریاتِ زندگی کے لئے ان کا محتاج بنا دیتی ہیں، اور جب وہ ان کا محتاج ہو جاتا ہے تو پھر وہ اسے اپنا محکوم بنا لیتی ہیں۔ قرآنی نظام، رزق کی تقسیم اس طرح کرتا ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج ہی نہیں رہتا۔ اور جب وہ کسی انسان کا محتاج نہیں رہتا، تو کسی کا محکوم بھی نہیں بنتا۔ اس (اقبالؒ) نے جنّتِ ارضی کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ ؎

جنّتِ ارضی

کس در نیجا، سائل و محروم نیست
عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست!

چونکہ اس میں کوئی بھی اپنی ضروریاتِ زندگی کے لئے کسی کا محتاج نہیں ہوتا، اس لئے اس معاشرہ میں غلام اور آقا۔ حاکم اور محکوم کی تفریق ہی نہیں ہوتی۔ اقبالؒ نے جو کہا ہے کہ ؎

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

تو وہ اسی جنّتِ ارضی کی خصوصیت ہے جو قرآنی نظام سے وجود میں آتی ہے۔

———(-)———

شاعر نہیں

اقبالؒ کے متعلق ہماری بنیادی غلط نگہی یہ ہے کہ ہم نے اسے یا تو ایک شاعر سمجھا ہے اور یا فلاسفر ——— قوم نے اسے جو سب سے بڑا "اعزاز" بخشا ہے، وہ "شاعرِ مشرق" کا ہے۔ وہ عمر بھر کہتا رہا کہ بابا! میں شاعر نہیں! ؎

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ

بلکہ تنگ آ کر یہاں تک کہنے پر مجبور ہو گیا کہ ؎

نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم مثالِ شاعراں افسانہ بستم
نہ بینی خیر ازاں مردِ فرودست کہ بر ما تہمتِ شعر و سخن بست

یہ اس لئے کہ ؎

شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق افکار میں سرمست، نہ خوابیدہ نہ بیدار

نہ فلاسفر

جہاں تک فلسفہ کا تعلق ہے، اس نے دو لفظوں میں ساری بات کہہ دی کہ ——— ہے فلسفہ زندگی سے دوری! ——— اور فلاسفرز سے برملا کہا کہ ؎

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے بری ہے مستیٔ اندیشہ ہائے افلاکی

چنانچہ وہ عمر بھر، زمین کے ہنگامے سہل کرنے کی تدابیر سوچتے رہے۔ ان ہنگاموں میں سرِفہرست روٹی کا مسئلہ ہے۔ جس سے محرومی سے محتاجی پیدا ہوتی ہے۔ جو شرف و تکریمِ انسانیت کو کچل کر رکھ دیتی ہے۔

یہ مسئلہ کب سے ان کی توجہ کا مرکز بنا، بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ یوں تو ہمارا دور، اقتصادیات کا زمانہ (AGE OF ECONOMICS) کہلاتا ہے لیکن ہمارے ہاں اس لئے بہت مقبول رہے ...... عرصہ سے اہمیت اختیار کی ہے۔ اقبالؒ کا قلبِ حسّاس اور نگۂ دُور بیں اس کی منتظر نہیں تھی کہ یہ مسئلہ یہاں اہمیت اختیار کرے تو وہ لب کشائی کرے۔ اُردو زبان میں اقتصادیات پر سب سے پہلی کتاب ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کے مصنّف اقبالؒ تھے، حالانکہ تعلیم کے زمانے میں اقتصادیات (اکنامکس) ان کا

علم الاقتصاد

اعلیٰ مضمون بھی نہیں تھا۔ اور ان کی عمر بھی تیس بتیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اتنی سی عمر میں فلسفہ کے اس ... طالبِ علم نے وہ کتاب لکھی جس کے دیباچہ میں کہا:-

اس میں کچھ شک نہیں کہ تاریخِ انسانی کے سیلِ رواں میں، اصولِ مذہب بھی بے انتہا مؤثر ثابت ہوئے ہیں۔ مگر یہ بات بھی روزمرّہ کے تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہوتی ہے کہ روزی کمانے کا دھندا ہر وقت انسان کے ساتھ ساتھ ہے اور چپکے سے اس کے ظاہری اور باطنی قویٰ کو اپنے سانچے میں ڈھالتا رہتا ہے۔ ذرا خیال کرو کہ غریبی، یا یوں کہو کہ ضروریاتِ زندگی کے کامل طور پر پورا نہ ہونے سے انسانی طرزِ عمل کہاں تک متأثر ہوتا ہے۔ غریبی قویٰ انسانی پر بہت بُرا اثر ڈالتی ہے۔ بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلّا آئینہ کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدّنی لحاظ سے اس کا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے۔ معلّمِ اوّل، یعنی حکیم ارسطو سمجھتا تھا کہ غلامی تمدّنِ انسانی کے قیام کے لئے ایک ضروری جزو ہے۔ مگر مذہب اور زمانۂ حال کی تعلیم نے انسان کی جبلّی آزادی پر زور دیا اور رفتہ رفتہ مہذّب قومیں محسوس کرنے لگیں کہ یہ وحشتناک تفاوتِ مدارج، بجائے اس کے کہ قیامِ تمدّن کے لئے ایک ضروری جزو ہو، اس کی تخریب کرتا ہے اور انسانی زندگی کے ہر پہلو پر نہایت مذموم اثر ڈالتا ہے۔ اسی طرح اس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ آیا مفلسی بھی نظمِ عالم میں ایک ضروری جزو ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دلخراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظّارہ ہمیشہ کے لئے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے۔ (اقبالؒ اور قرآن ص ۱۷۱)

اس کے بعد یہ نوجوان، مزید تعلیم کے حصول کیلئے یورپ چلا گیا۔ اس زمانے میں یورپ میں، نظامِ سرمایہ داری انتہائی عروج پر تھا۔ یہ نظام کن بنیادوں پر استوار تھا، اس کے متعلق میں اس مقام پر صرف ایک اقتباس پر اکتفا کروں گا۔ اس نظام کے ایک علمبردار (WILLIAM - TOWNSEND) نے ایک کتاب لکھی تھی — (DISSERTATION ON THE POOR LAWS) اس میں اس نے کہا تھا:-

بھوک کا کوڑا ایسا سخت ہے جو وحشی سے وحشی اور تند خو سے تند خو جانور کو رام کر دیتا ہے

اس سے سرکش انسان بھی مطیع و فرمانبردار بن جاتا ہے۔ اس لئے اگر تم غریبوں سے کام لینا چاہتے ہو تو اس کا ذریعہ فقط ایک ہے۔ یعنی بھوک ـــــ بھوک ہی وہ، جذبۂ محرکہ ہے جس سے غریب اور محتاج ہر قسم کا کام کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔

(بحوالہ - نظامِ ربوبیت - صفحہ ۳۲۳)

یورپ ہی اقبالؒ نے ان کوڑوں کے خونچکاں زخموں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ واپسی پر انہوں نے ۱۹۱۱ء میں، علی گڑھ میں وہ معرکہ آرا تقریر کی جس کا شہرہ آج تک قائم و دائم ہے۔ (مولانا) ظفر علی خان (مرحوم) نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ جس کا عنوان تھا ـــــ

مسلمانوں کا اِفلاس

ـــــ ملّتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر ـــــ اس میں اقبالؒ نے کہا تھا:-

یقیناً کسی کو اس بات سے انکار نہ ہوگا کہ غریب مسلمان کی اقتصادی حالت نہایت ہی افسوسناک اور قابلِ رحم ہے۔ شہروں میں جہاں کی آبادی کا جزوِ غالب مسلمان ہیں، معمولی درجہ کے مسلمانوں کی قلیل اُجرت، غلیظ مکان، اور ان کے پیٹ بھر روٹی کے ترستے ہوئے بچوں کا حسرت ناک نظارہ کس نے نہیں دیکھا؟ لاہور کے کسی اسلامی محلہ میں جا نکلو۔ ایک تنگ و تاریک کوچہ پر تمہاری نظر پڑے گی جس کے وحشت زا سکوت کے طلسم کو رہ رہ کر یا تو لاغر و نیم برہنہ بچوں کی چیخ پکار یا کسی پردہ نشین بڑھیا کی لجاجت آمیز صدا توڑتی ہوگی جس کی سوکھی اور مرجھائی ہوئی انگلیاں برقعہ میں سے نکل کر خیرات کے لئے پھیلی ہوئی ہوں گی۔ یہ تو گلی کی حالت تھی۔ الم زدہ گھروں کے اندر جا کر دیکھو تو صدہا مرد اور عورتیں ایسی پاؤ گے جنہوں نے کبھی اچھے دن دیکھے تھے؛ لیکن آج فاقہ کر رہی ہیں۔ کئی دن سے اناج کا ایک دانہ تک منہ میں اُڑ کر نہیں گیا۔ لیکن غیرت اور خودداری اجازت نہیں دیتی کہ خیرات کے لئے کسی کے آگے ہاتھ پسار دیں۔ ہمارے نوجوان علم بردارانِ اصلاحِ تمدّن جو پردہ کی رسم کو ہماری قوم کے قوائے روز افزوں انحطاط کا باعث قرار دینے کے عادی ہیں شاید یہ نہیں جانتے کہ اس انحطاط کا اصلی ذمہ دار پردہ نہیں بلکہ یہ جان فرسا اِفلاس ہے جو ہماری قوم کے ادانی و اقاصی کو کھائے جا رہا ہے۔

(بحوالہ مضامین اقبالؒ - مرتبہ تصدق حسین تاج - صفحہ ۱۰۳)

اس کے بعد علّامہ اقبالؒ "عمر بھر" بھوک سے کراہنے والوں کی دلخراش صداؤں کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کے لئے "مصروفِ جہاد رہے۔ اس کا علاج، قرآن کے معاشی نظام کا قیام تھا جس کے لئے انہوں نے پاکستان کا تصوّر عطا فرمایا تھا۔

ـــــ (٠) ـــــ

علّامہ اقبالؒ کے اس جہاد کے تین نمایاں مراحل ہمارے سامنے آتے ہیں۔ قلّتِ وقت کے پیشِ نظر، میں ان مراحل پر مختصر انداز سے روشنی ڈال سکوں گا۔

مرحلۂ اوّل ـــــ محنت کشوں کا مسئلہ

پہلی عالمگیر جنگ کے بعد، یورپ کی قوتیں جس طرح ترکی کے حصے بخرے کر کے، اس کی قوت اور شوکت کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کے درپے تھیں، اس کے احساس سے اقبالؒ کے قلبِ درد آگیں کی فلک رس صدائیں، اس زہرہ گداز نظم کی صورت میں لرزہ انگیز ہوئی تھیں جس کا عنوان "خضرِ راہ" ہے۔ اس کا عمودی موضوع تو یہ تھا کہ ؎

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ　　خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز!

لیکن اس میں ان اہم مسائل کا حل بھی (بزبانِ خضر) پیش کیا گیا ہے جن سے اس زمانے میں دنیا وقفِ اضطراب تھی۔ اس میں ایک اہم ترین مسئلہ "سرمایہ و محنت" کا بھی ہے۔ اس کے متعلق اقبالؒ کے سوال کے جواب میں خضر کہتا ہے: ؎

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے　　خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیامِ کائنات!

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر　　شاخِ آہو پہ رہی صدیوں تلک تیری برات

دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی　　اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار　　انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات!

اٹھ! کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے!　　(بانگِ درا)

۱۹۲۲-۲۳ء کی بات ہے۔ اس کے بعد، پیامِ مشرق کے آخری باب میں اس موضوع پر بڑی فکر انگیز بحث سامنے آتی ہے۔ لیکن ایک تو وہ بحثِ عمیق فلسفیانہ ہے اور دوسرے وہ فارسی زبان میں ہے' اس لئے ہم اس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے، بالِ جبریل تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس میں، دو تین مربوط نظمیں بڑی دلچسپ بھی ہیں اور معنی خیز بھی۔ اس سلسلہ کی پہلی نظم کا عنوان ہے۔

لینن ـــــ خدا کے حضور

جیسا کہ معلوم ہے، مارکسزم کا مشہور لیڈر اور مفکر، لینن، خدا، وحی، آخرت، سب کا منکر تھا۔ اس کا "خدا کے حضور" نظر آنا بڑا تعجب انگیز ہے لیکن وہ اپنے سوال تک پہنچنے سے پہلے، اس معمہ کو خود ہی حل کر دیتا ہے جب کہتا ہے کہ جو گتھی فلسفہ نہیں سلجھا سکا تھا، اسے عینی مشاہدہ نے حل کر دیا۔ تو (خدا) میرے سامنے ہے اس لئے تیرے وجود سے اب کیسے انکار کیا جا سکتا ہے؟ اس تمہید کے بعد وہ کہتا ہے کہ ؎

اک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں　　حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات!

جب تک میں جیا خیمۂ افلاک کے نیچے　　کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی رہی یہ بات

گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا　　جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

آپ نے غور فرمایا کہ اقبالؒ کے اس اسلوبِ بیان میں، وہ لینن کس طرح چلمنی انداز سے سامنے آرہا ہے جو زندگی بھر خدا کا منکر ہی نہیں، انتہائی درجہ کا سرکش تھا، اور اب خدا سے مخاطب! اس کی (سابقہ) خوئے سرکشی، روح میں تلاطم برپا کر رہی ہے، لیکن احترامِ خداوندی، دل کی بات کو گویا کانہ زبان تک آنے کے راستے میں حائل ہے۔ بات حلق تک آتی ہے، پھر لوٹ جاتی ہے۔ جھجکتے اور لرزتے ہوئے، بصد توقف و تامل، اسے پھر لوک زبان تک لانے کی کوشش (بلکہ جرأت) کرتا ہے۔ کچھ ایسا ہی تامل اور اضطراب تھا جس سے تنگ آکر ایک وقت غالبؔ مرحوم پیچ و تاب نے کہا تھا کہ ؎

از سینہ تا بجنید بسا آدم و فسردم　　این نیم قطرہ خوں کہ زمژگاں چکیدنی است

اب سنیئے وہ بات جسے لینن اس صبر آزما توقف کے بعد زبان تک لایا۔ کہا کہ میں جانتا ہوں کہ " تو خالقِ اعصار و نگارندۂ آنات" ہے، لیکن میں معلوم یہ کرنا چاہتا ہوں کہ ؎

وہ کونسا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود　　وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات ؟

یہ پوچھنے کی ضرورت اس لئے پڑی کہ ؎

مشرق کے خداوند، سفیدانِ فرنگی　　مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات!

مشرق میں سفید فام مغربی اقوام کی پرستش ہوتی ہے۔ اور مغربی اقوام چاندی سونے (دولت) کی پرستار ہیں۔ ان دونوں کے خدا تو یہ ہیں! میں معلوم یہ کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کونسے آدم کے خدا ہیں؟

آپ نے غور فرمایا کہ اقبالؒ کا تبیانِ حقیقت کا انداز کس قدر بلیغ اور حسین ہوتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اس وقت خدا کی حکمرانی دنیا میں کہیں بھی نہیں، اس لئے لینن کا یہ سوال بالکل فطری ہے، اور ایسا جس کا جواب کوئی نہیں بن پڑ سکتا ——— کہ وہ کونسا آدم ہے کہ تو جس کا معبود؟ ——— ہم پر تو منکرینِ خدا ہونے کا الزام دھر دیا۔ لیکن میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ خدا کے مومن کون ہیں، اور وہ کس دنیا میں بستے ہیں؟

اقبالؒ نے اس موضوع پر بڑی تفصیل سے لکھا ہے کہ ——— نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری ——— اور ——— یہ تیرے مومن کا فرِ تمام زنّاری ——— وہ نہ اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے، نہ دوسروں کو یہ کہہ کر فریب میں رکھنا چاہتا ہے کہ دنیا میں تو کروڑ مومن بستے ہیں۔ وہ واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ ؎

تیرے محیط میں کہیں گوہرِ زندگی نہیں!　　ڈھونڈ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف صدف

اس میں نہ مشرق کی استثناء ہے نہ مغرب کی تمیز!

مغرب ز تو بیگانہ مشرق ہمہ افسانہ　　وقت است کہ در عالم نقشِ دگر انگیزی

لینن کہتا ہے کہ اہلِ مشرق جن (مغربی) خداؤں کو پوجتے ہیں، ان کے ہاں کیفیت یہ ہے کہ ؎

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبّر، یہ حکومت　　پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیمِ مساوات!

اس کے بعد وہ اپنے ترکش سے ایک اور تیر نکالتا ہے، اور کہتا ہے کہ ؎

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں　　ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات!

دنیائے اخلاق کا ایک قدیم معمہ ہے جسے ذہنِ انسانی آج تک حل نہیں کر سکا۔ معمہ یہ ہے کہ
اگر خدا خیر ہے، تو دنیا میں شر کا وجود کیوں ہے؟
اگر شر کا وجود اس کی مرضی سے ہے تو وہ خیر نہیں۔
اور، اگر شر کا وجود اس کی مرضی کے خلاف ہے تو وہ قادرِ مطلق نہیں۔

فیضؔ نے خدا سے کہا ہے کہ ترا دعوئے ہے کہ تو عادل بھی ہے اور قادر بھی۔

عدل کا تقاضا ہے کہ بندۂ مزدور کو اس کی محنت کا ماحصل ملے لیکن وہ نہیں مل رہا اور بندۂ مزدور کے اوقات سخت تلخ ہیں۔ اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ خدا عادل تو ہے لیکن اس کے فیصلے عملاً نافذ نہیں ہوتے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ وہ قادر نہیں (JUDICIARY) تو اس کے پاس ہے لیکن (EXECUTIVE) اس کے پاس نہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو اس کے عادل ہونے کا فائدہ کیا ہے!

اور اس کے بعد وہ اس نہایت پیچیدہ سوال کا جواب خود ہی دیتا ہے کہ میں مانتا ہوں کہ تو عادل بھی ہے اور قادر بھی۔ لیکن تیرا قانون یہ ہے کہ انسان کے عمل اور اس کے نتائج کے محسوس طور پر سامنے آنے میں مہلت کا وقفہ ہوتا ہے۔ اور یہ خود تقاضائے عدل ہے۔ جس طرح دنیاوی قانون کی رُو سے بھی حاملہ عورت کی سزائے موت، وضعِ حمل تک ملتوی کر دی جاتی ہے۔ اس قانونِ مہلت کی رُو سے وہ پوچھتا یہ ہے کہ ؎

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟　　دنیا ہے تری منتظرِ یومِ مکافات!

یہ نہیں کہ مجھے یقین نہیں کہ سرمایہ پرستی کا سفینہ ڈوبے گا یا نہیں۔ سوال صرف "کب" کا ہے۔ یہ کب ڈوبے گا؟ تیری دنیا اس دن کا بڑی بے تابی سے انتظار کر رہی ہے! اس لئے آپ ذرا جلدی کریں۔

(۰)

"کب" کا یہ سوال، فرشتوں کے دل میں بھی مچل رہا ہے جس کا تذکرہ اگلی نظم میں سامنے لایا گیا ہے۔ اس کا عنوان ہے ___ فرشتوں کا گیت

فرشتوں کا گیت

قرآنِ مجید نے قصۂ آدم، اپنے مخصوص تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کسی خاص شخص (آدم) یا ایک جوڑے (آدم اور حوّا) کا تذکرہ نہیں۔ وہ خود آدمی کی داستانِ حیات ہے وہ تاریخِ انسانیت کا تمثیلی بیان ہے۔ اس تمثیل میں یوں سمجھئے گویا ایک مجلس میں خدا اور اس کے فرشتے بیٹھے ہیں اور بات اس مخلوق کی ہو رہی ہے جسے دنیا میں صاحبِ اختیار بنا کر بھیجا جا رہا ہے۔ (وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ..... (۲/۳۰) ملائکہ جب اس ہیولیٰ آب و گل پر گہری نگاہ ڈالتے ہیں تو انہیں اس میں خون کے چھینٹے اور آگ کی چنگاریاں نظر آتی ہیں۔ وہ عرض کرتے ہیں: (اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ) بارِ الٰہا! جرأت معاف، ہو تو ہم عرض کریں کہ کیا تو کرۂ ارض کو ایسی مخلوق کے حوالے کرنا چاہتا ہے جو وہاں خوں ریزیاں اور فساد انگیزیاں کرے گی؟ جواب ملا، (اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ..... (۲/۳۰)

گھبراؤ نہیں، ہم جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے۔

اس پر فرشتے خاموش ہو گئے اور نہایت گہری نظروں سے تاریخ انسانیت کا مطالعہ، بلکہ مشاہدہ کرتے رہے۔ جو کچھ وہ دیکھتے اس پر بڑے ضبط اور صبر سے کام لیتے۔ لیکن ضبط کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے؟ ہمارے دور میں پہنچ کر، جب انہوں نے آدم کی عالمگیر سفاکیوں اور تباہ کاریوں کو دیکھا تو ان سے نہ رہا گیا، اور ایک دن بارگاہِ خداوندی میں لب کشائی کی جرأت کر ہی لی۔

لیکن ملائکہ کی جرأتِ لب کشائی اور ابلیس کے استکبار میں بڑا فرق تھا۔ انہوں نے بھی ادب و احترام کو ملحوظ رکھا تھا لیکن اس کے باوجود اس کے حرفِ تمنا میں طعن و تشنیع کا کھلا ہوا نشتر نہ سہی، چھپی ہوئی پھانس ضرور تھی۔ ملائکہ کی عرض داشت کا انداز کچھ اور تھا۔ انہوں نے کہا۔۔۔ ؎

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی
نقش گرِ ازل ترا نقش ہے نا تمام ابھی

اس "ابھی" میں گہری حقیقتیں سربستہ ہیں۔ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ "کیوں؟ کیا وہی نہیں ہوا، جو ہم کہتے تھے؟ کیا آدم ویسا ہی نہیں نکلا جیسا ہم نے اندازہ لگایا تھا؟" انہوں نے کہا یہ۔۔۔ کہ ہمیں اس کا تو یقین ہے کہ آدم ویسا ہی ہوگا جیسا آپ کی مشیت میں تھا، لیکن ابھی تک اس معیار پر پورا نہیں اترا۔ ابھی یہ نقش نا تمام ہے۔

ارتقائی منازل

اور اس میں عظیم حقیقت پوشیدہ ہے۔ یہ کائنات اور انسان، پہلے ہی دن اپنی مکمل شکل میں وجود پذیر نہیں ہو گئے تھے۔ یہ ابتدائی ہیولیٰ کی صورت میں تخلیق کئے گئے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے ہزارہا ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد اس منتہیٰ تک پہنچنا تھا جو ان کا مقصود تھا۔ قرآنِ مجید میں اس سلسلۂ ارتقاء کے شواہد موجود ہیں اور کلامِ اقبالؒ میں اس کی بکثرت تفصیلات۔ ذرا ان دو قطعہ بند شعروں کو دیکھئے ؎

یکے در معنیٔ آدم نگر، از من چہ می پرسی؟
ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے

چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے
کہ یزداں را دل از تاثیر او، پرخوں شود روزے!

یہ پیکرِ آب و گل ہنوز ارتقائی منازل طے کر رہا ہے۔ اسے تکمیل تک پہنچنے دو، پھر دیکھنا کہ یہ کیا بنتا ہے ؎

مہ و ستارہ سے آگے مقام ہے جس کا
وہ مشتِ خاک ابھی آوارگانِ راہ میں ہے

ان حقائق کی روشنی میں دیکھئے کہ ملائکہ کی "ابھی" میں کتنے راز سربستہ تھے! انہوں نے عرض کیا تھا کہ بارِ الٰہا! ؎

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی
نقش گرِ ازل ترا نقش ہے نا تمام ابھی

عقلِ حیلہ جو کی اس بے زمامی، عشقِ انسانیت ساز کی اس بے مقامی اور آدم کی نا تمامی کا نتیجہ یہ ہے کہ ؎

خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر
تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی

تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی، خواجہ بلند بام ابھی

دانش و دین و علم و فن، بندگیٔ ہوس تمام
عشقِ گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی

جوہرِ زندگی ہے عشق، جوہرِ عشق ہے خودی
آہ کہ ہے یہ تیغِ تیز، پردگیٔ نیام ابھی!
(بالِ جبریل - صفحہ ۱۴۸)

ملائکہ کی اس عرضداشت میں اتنا ہی نہیں کہا گیا کہ آدم کی ناکامی کا نتیجہ یہ ہے کہ فساد انگیزیوں اور خونریزیوں کی ابلیسی قوتیں ساری دنیا میں برہنہ رقص کر رہی ہیں، انہوں نے ضمناً یہ بھی کہہ دیا کہ جب آدم تکمیل تک پہنچ گیا تو ان میں سے کوئی قوت بھی باقی نہیں رہے گی۔ انہوں نے بھی زیرِ لب یہی کہا تھا کہ بارِ الٰہا! اس میں اس قدر تاخیر کیوں ہو رہی ہے[1]؟

ملائکہ کی اس عجلت پسندی کے جواب میں، اگلی نظم میں جس کا عنوان ہے "فرمانِ خدا (فرشتوں سے)" ایک اور بسیط حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ یہ وہ نظم ہے جس کا صحیح مفہوم نہ سمجھنے سے بڑی تخریب انگیز غلط فہمیاں پیدا ہوتی (یا پیدا کی جاتی) ہیں، اور ہمارے تشدد پسند کمیونسٹ تو اس شعر کو گلی گلی، کوچے کوچے، گاتے پھرتے اور کہتے ہیں کہ دیکھو! خدا خود "جلاؤ، گھیراؤ" کے طریق کی تاکید کرتا، بلکہ فرشتوں کو ایسا کرنے کا حکم دیتا ہے اور اقبالؒ اس پیغام کو عام کرتا ہے کہ

فرمانِ خدا

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اصل حقیقت کچھ اور ہے۔

خدا کے کائناتی ارتقاء کے پروگرام کی رفتار (ہمارے حساب و شمار کی رو سے) بڑی سست ہوتی ہے۔ اس میں ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔ وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ (۲۲/۴۷، ۳۲/۵) بلکہ پچاس پچاس ہزار سال کا (۷۰/۴) اگر اس پروگرام میں انسان کے دست و بازو بھی شریک ہو جائیں تو پھر یہ مدت انسانوں کے حساب و شمار کے دنوں میں سمٹ آتی ہے۔ انسانی دنیا میں اس قسم کا انقلاب جماعتِ مؤمنین کے ہاتھوں رونما ہوتا ہے۔ اس کا طریق کار یہ ہے کہ لوگوں کے قلب و دماغ میں انقلاب پیدا کیا جاتا ہے اور ذہنیتوں کے اس انقلاب سے، قوم میں تعمیری انقلاب رونما ہو جاتا ہے۔ یہ طریق کار خود خدا کا متعین فرمودہ ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ... ۝ (۱۳/۱۱) "خدا کسی قوم کی حالت میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا جب تک وہ اپنی ذہنیت میں (نفسیاتی) تبدیلی نہ پیدا کرے"۔ اس طریقِ انقلاب میں کسی قسم کی تخریب نہیں ہوتی، تباہی نہیں ہوتی، فساد نہیں ہوتا، خونریزی نہیں ہوتی۔

لیکن اگر انسانوں کی ایسی جماعت کھڑی نہ ہو۔ اور دوسری طرف، سلب و نہب کی خون آشام

---

[1] بالِ جبریل ہی کے اس شعر کو دیکھئے ہے

حرم کے دل میں سوزِ آرزو پیدا نہیں ہوتا
کہ پیدائی تری اب تک حجاب آمیز ہے ساقی!

اور جس تپش و خلش اور سوز و گداز کی یہ فغانِ سحری تخلیق ہے، اس کا اندازہ لگائیے!

قوتیں حدود فراموش ہوتی چلی جائیں، تو پھر مظلوم و محتاج عوام، تنگ آ کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور بپھرے ہوئے سیلاب کی طرح ہر اس چیز کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتے ہیں جو ان کی لپیٹ میں آ جائے۔ وہ سیلاب نہ مسجد و مندر میں تمیز کرتا ہے، نہ ظالم اور مظلوم میں تفریق۔ ان کے جنون خیز پروگرام میں، تخریب ہی تخریب ہوتی ہے۔ تعمیر نہیں ہوتی، یہ انقلاب نہیں ہوتا، فساد ہوتا ہے۔ عام اصطلاح میں اسے زمانے کے تقاضے کہا جاتا ہے اور قرآن کی اصطلاح میں "عذاب لانے والے ملائکہ"۔ ہمارے زمانے میں اس قسم کا (وسیع پیمانے پر) "فساد" روس میں برپا ہوا جسے اقبالؒ نے (یوں کہئے گویا) اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ان کی نگہ حقیقت بین دوررس نے دیکھا کہ اس پروگرام میں لاؔ ہی لاؔ (یعنی تخریب ہی تخریب) ہے۔ اِلّاؔ (مثبت یا تعمیر) کا شائبہ تک نہیں۔ دست

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ لا سلاطین، لا کلیسا، لا الٰہ (ابلیس چہ باید کرد)

مَیں نے ان کے پروگرام کی مختلف کڑیوں پر غور کیا ہے۔ وہ ظلم و استبداد کی حکومتوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ یہ قوتیں، مذہبی پیشوائیت کے سہارے مصروفِ جور و ستم رہتی ہیں۔ اس لئے وہ مذہب کو بھی مٹا دینا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کا جوشِ جنوں یہیں تک نہیں رہتا۔ آگے بڑھتا ہے۔ وہ خود خدا کی ہستی کا بھی انکار کر دیتے ہیں۔ اس انکار کا نتیجہ یہ ہے کہ انہوں نے ہر قسم کے ضوابطِ اخلاق و اقدار کو مسترد کر دیا ہے۔ لینن کے الفاظ ہیں، جو اس نے سنہ ۱۹۲۰ء میں، یوتھ کمیونسٹ لیگ کی تیسری کانفرنس میں، نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہے تھے:۔

ہم ان تمام ضوابطِ اخلاق کو مسترد کرتے ہیں جو کسی مافوق الفطرت سرچشمہ (یعنی وحیٔ خداوندی) یا طبقاتی تصوّر کے پیدا کردہ ہوں۔ ہم علانیہ کہتے ہیں کہ اخلاقیات کا اس قسم کا تصوّر فریب ہے۔ یہ تصوّر زمینداری اور سرمایہ داری کے مفاد کے تحفّظ کی خاطر محنت کشوں اور کاشتکاروں کے دلوں کو تاریکی اور دھند میں رکھنے کے لئے وضع کیا گیا ہے..... ان کا دعوےٰ ہے کہ ان کا ضابطۂ اخلاق احکام خداوندی پر مبنی ہے۔ ہم خدا کی ہستی ہی کے قائل نہیں...... ہم کسی ابدی صداقت کے قائل نہیں۔ اس قسم کے اخلاق کے متعلق جس قدر افسانے وضع کئے گئے ہیں، ہم ان سب کا پردہ چاک کر کے رکھ دیں گے۔ (بحوالہ۔ نظامِ ربوبیت۔ صفحہ ۱۳۳)

یہ ٹھیک ہے کہ اخلاق کا جو ضابطہ مذہبی پیشوائیت کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے، وہ نظامِ ملوکیت اور سرمایہ داری کے مفاد کے تحفّظ کی ضمانت کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ لیکن اسے مسترد کرتے ہوئے خدا اور مستقل اقدار سے انکار کر دینا، شدتِ جنون کا نتیجہ ہے۔ جب اخلاق و اقدار کے وجود سے انکار کر دیا جائے تو پھر معاشرہ میں تبدیلی لانے کے لئے، تشدد اور تلوار کے سوا کونسا طریق رہ جاتا ہے؟ لینن نے، انجلز کے ایک مقالہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ

انقلاب ایک ایسا عمل ہے جس کی رو سے آبادی کا ایک حصّہ، دوسرے حصہ پر اپنا

اختیار اور تسلط، قوت و استبداد، نوکِ شمشیر، گولیوں کی بوچھاڑ اور آتشیں گولوں کے دھماکے سے زبردستی قائم کرتا ہے۔ (نظامِ ربوبیت۔ صفحہ ۳۲۳)

روس کا یہی وہ لاؔ کا پروگرام تھا جس کے نتائج و عواقب سے متنبہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے اس سے کہا تھا کہ، یاد رکھو! ؎

در مقامِ لا نیاساید حیات ۔۔۔ سوئے الّا می خرامد کائنات

لا و الّا برگ و سازِ اُمتاں ۔۔۔ نفی بے اثبات، مرگِ اُمتاں

اس کے بعد کہا: ؎

ایکہ می خواہی نظامِ عالمے ۔۔۔ جستۂ اورا، اساسِ محکمے؟

یہ اساسِ محکم کہاں سے ملے گی؟ فرمایا:۔

داستانِ کہنہ شستی باب باب ۔۔۔ فکر را روشن کن از اُمّ الکتاب (اقبالؒ اور قرآن صفحہ ۱۸۹)

ان تصریحات کی روشنی میں کیا آپ ایک لمحہ کے لئے بھی اس کا تصور کر سکتے ہیں کہ اقبالؒ کمیونزم کا حامی اور اس کے "جلاؤ گھیراؤ" کے تشدد آمیز طریق کار کا مؤید تھا؟ ۱۹۲۳ء کا ذکر ہے کہ شمس الدین حسن نامی، ایک کمیونسٹ نے اپنے ایک مضمون میں لکھ دیا کہ "اقبالؒ ایک اشتراکی ہی نہیں، بلکہ اشتراکیت کے مبلغ اعلیٰ ہیں"۔ علامہ اقبالؒ نے ایک دن کے بھی توقف کے بغیر، ۲۴ جون ۱۹۲۳ء کے روزنامہ زمیندار میں حسب ذیل خط شائع کرا دیا:۔

(۱) میرے افکار کو بالشوزم سے منسوب کرنا غلط ہے۔ بالشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے۔

(۲) میں مسلمان ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین حل قرآن مجید نے تجویز کیا ہے۔

(۳) روسی بالشوزم، یورپ کی ناعاقبت اندیشی اور خود غرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست ردِّ عمل ہے۔ لیکن مغرب کی سرمایہ داری اور روس کا بالشوزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہمیں بتائی ہے۔ (اقبالؒ اور قرآن صفحہ ۱۹)

اس کے بعد آپ اس نظم کی طرف آئیے جس کے صحیح مفہوم کے سمجھنے کے لئے اس طولانی تمہید کی ضرورت لاحق ہوئی۔ اس نظم میں درحقیقت، عالمگیر انسانیت کو وارن (WARN) کیا گیا ہے کہ اگر تم نے مستبد قوتوں کی دراز دستیوں کو نہ روکا، تو زمانے کے تقاضے، ایسا سیلاب بلا بن کر ابھریں گے جس کے سامنے، انسانیت کی کوئی متاعِ حیات بھی ٹھہر نہیں سکے گی۔ یہ وارننگ قرآن کریم نے چودہ سو سال پہلے ان الفاظ میں دی تھی کہ

وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً ۖ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ (۸/۲۵)

اس فتنہ سے بچنے کی کوئی حفاظتی تدبیر کر لو، کہ جب وہ آتا ہے تو اپنے آپ کو ظالموں تک ہی محدود

نہیں رکھا کرتا۔ وہ سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتا ہے۔ یاد رکھو! خدا کا قانونِ مکافات بڑی قوتوں کا مالک بھی ہے اور مجرموں کا پیچھا کرنے میں انتھک بھی —— حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

خدا کے اس جلال قانونِ مکافات کی تشریح حضورؐ نے ایک نہایت دلنشیں مثال کی رو سے فرمائی۔ ترمذی کی ایک حدیث ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا:-

کچھ لوگ ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ اُن میں سے کچھ اوپر کے حصّے میں پہنچ گئے۔ کچھ نیچے کے حصّے میں۔ جو نچلے حصّے میں تھے وہ پانی لینے کے لئے اوپر گئے۔ اوپر والوں نے انہیں یہ کہہ کر پانی لینے سے روک دیا کہ اس سے انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ نیچے والوں نے کہا: بہت اچھا، ہم نیچے سوراخ کر کے پانی حاصل کر لیں گے۔ اب اگر نیچے والوں کو پانی دے کر اس اقدام سے نہ روکا گیا تو ظاہر ہے کہ اوپر اور نیچے والے سب غرق ہو جائیں گے اگر روک دیا گیا تو سب بچ جائیں گے۔ (ترمذی۔ جلد دوم۔ باب الفتن)

یہ نتیجہ ہوتا ہے اس طوفان کا جو زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہونے والے، عوام کے ہاتھوں بپا ہوتا ہے اور جس کی شعلہ فشانیوں سے کوئی بھی محفوظ نہیں رہتا۔

ان تشریحات کی روشنی میں اس نظم کو دیکھئے جس کا مفہوم سمجھنے میں، میں سمجھتا ہوں، اب آپ کو کوئی دقت نہیں ہوگی۔ نظم کا عنوان ہے۔

فرمانِ خدا —— فرشتوں سے

اور نظم ہے:-

اٹھو[1]! میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو　　کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو!
گرماؤ غریبوں کا لہو سوزِ یقیں سے　　کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ　　جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہیں روزی　　اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے　　پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو
حق را بسجودے صنماں را بطوافے　　بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے　　میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو![2]

---

[1] ایک مشہور شعر ہے:-
زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند　　حق را بسجودے و نبی را بدرودے!

[2] ضربِ کلیم میں ہے:-
اے شیخ! امیروں کو مسجد سے نکلوا دے　　ہے ان کی نمازوں سے محراب ترش ابرو

تہذیبِ نوی کارگہ شیشہ گراں ہے
آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو!

(○)

یوں تو اقبالؒ کا پیغام، پوری نوعِ انسان کے لئے تھا لیکن اس کی اولیں مخاطب، ملّتِ اسلامیہ (مسلمانوں کی قوم) تھی جو ملوکیت، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت، تینوں کی صید زبوں تھی۔ یہ موضوع ایک مستقل تصنیف کا متقاضی ہے۔ اور ہم نے اس پر بہت کچھ لکھا ہے۔ وہ اس مظلوم و مقہور قوم سے کہتے ہیں:

اے کشتۂ سلطانی و مُلّائی و پیری — باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری (جاوید نامہ)

اقبالؒ نے مُلّائی و پیری کے خلاف جو کچھ کہا ہے اسے تو سرِ دست چھوڑیئے۔ اس نے سلطانی (ملوکیت یا شاہنشاہیت) کے خلاف جو بات کہی ہے، میری نظر سے اس کی مثال کہیں نہیں گذری۔ ہمارا آج کا موضوع "محتاجی" ہے۔ یہ خیال عام ہے کہ اور لوگ تو، کم و بیش، کسی نہ کسی کے محتاج

گدائے بے حیا

ہوتے ہیں، لیکن بادشاہ (سربراہِ مملکت) کسی کا محتاج نہیں ہوتا۔ سب اس کے محتاج ہوتے ہیں۔ اقبالؒ کہتا ہے کہ یہ غلط ہے۔ وہ سب سے زیادہ محتاج ہوتا ہے۔ قبل اس کے کہ ہم اس نکتہ کی تائید میں اقبالؒ کے دلائل تک پہنچیں، اصولی طور پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ محتاج کہتے کسے ہیں۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ جو شخص اپنی محنت سے رزق حاصل کرتا ہے وہ کسی کا محتاج نہیں ہوتا۔ (یہ اور بات ہے کہ اس کا رزق چھین کر اسے محتاج بنا دیا جائے) محتاج وہ ہوتا ہے جو دوسروں کی کمائی پر زندگی بسر کرے۔ محتاج کی اس (DEFINITION) کے بعد جس کے حقیقت ہونے میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا، بالِ جبریل کی اس نظم کو سنیئے جس کا عنوان ہے ـــــ گدائی ـــــ سنیئے، اور محوِ حیرت رہ جایئے کہ ہم کیا سن رہے ہیں! محوِ حیرت ہی نہیں بلکہ قدرے محجوب بھی کہ ایسی بدیہی بات، اس سے پہلے ہماری سمجھ میں کیوں نہ آئی! جس قدر اس کا موضوع انوکھا ہے اسی قدر اس کا اندازِ بیان بھی شوخ ہے۔ فرماتے ہیں:

میکدے میں ایک دن اِک رندِ زیرک نے کہا — ہے ہمارے شہر کا والی گدائے بے حیا!

ذرا دیکھو کہ:

"تاج پہنایا ہے کس کی بے کلاہی نے اُسے؟ — کس کی عریانی نے بخشی ہے اسے زرّیں قبا؟
اس کے آبِ لالہ گوں کی خونِ دہقاں سے کشید — تیرے میرے کھیت کی مٹی ہے اس کی کیمیا!
اس کے نعمت خانے کی ہر چیز ہے مانگی ہوئی — دینے والا کون ہے؟ مردِ غریب و بے نوا!
مانگنے والا گدا ہے! صدقہ مانگے یا خراج — کوئی مانے یا نہ مانے، میر و سلطاں سب گدا"[1]

---

[1] بالِ جبریل میں نظم کے آخر میں لکھا ہے (ماخوذ از انوری) لیکن اقبالؒ نے دیگر متعدد مقامات پر بھی اس موضوع کو پیش کیا ہے۔

ایک غزل میں وہ باندازِ دگر اسی خیال کو پیش کرتے ہیں، جہاں کہتے ہیں :ـ

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے! خراج کی جو گدا ہو، وہ قیصری کیا ہے!

ایک اور شعر :ـ

کسے نہیں ہے تمنائے سروری، لیکن خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے!

خودی کی موت اسی گداگری سے واقع ہوتی ہے ـ اس باب میں، وہ عہدِ قدیم کی ملوکیت اور عصرِ حاضر کی جمہوریت، دونوں کو ہم سنگ قرار دیتے ہیں جب کہتے ہیں کہ :ـ

مجلسِ ملّت ہو یا پرویز کا دربار ہو ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر

گداگری سے خودی کی موت واقع ہوتی ہے، اور خودی کی موت کے بعد، کمینگی کی زندگی ـ بالِ جبریل ہی میں علامہؒ نے اس نکتہ کو بڑے ہی دلآویز انداز میں پیش کیا ہے ـ فرماتے ہیں :ـ

اک مفلسِ خود دار یہ کہتا تھا خدا سے میں کر نہیں سکتا گلۂ دردِ فقیری!
لیکن یہ بتا، تیری اجازت سے فرشتے کرتے ہیں عطا مردِ فرومایہ کو میری؟

مردِ فرومایہ اس لئے کہ ـــ خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے؟

قزاقی

ان مقامات میں تو اقبالؒ نے ان والیانِ مملکت کو "گداگر" کہا ہے ـ ضربِ کلیم کی ایک نظم میں وہ انہیں ڈاکو کہہ کر پکارتا ہے ـ سکندر کے سامنے ایک بحری قزاق، مجرم کی حیثیت سے پیش ہوتا ہے ـ سکندر اس سے کہتا ہے :ـ

صلہ تیرا، تری زنجیر یا شمشیر ہے میری کہ تیری رہزنی سے تنگ ہے دریا کی پہنائی!

قزاق جواب دیتا ہے :ـ

سکندر! حیف تو اس کو جوانمردی سمجھتا ہے گوارا اس طرح کرتے ہیں ہم چشموں کی رسوائی؟
ترا پیشہ ہے سفاکی، مرا پیشہ ہے سفاکی! کہ ہم قزاق ہیں دونوں، تو میدانی میں دریائی!

کوئی مانے یا نہ مانے، میر و سلطاں سب گدا!

———(۰)———

اس مقام پر ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے جسے سامنے لائے بغیر، آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا ـ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مملکت تو قرآن بھی قائم کرتا ہے ـ اس مملکت کا سربراہ بھی ہوتا ہے ـ اس سربراہ کو اپنے گذارے کے لئے بہرحال، مملکت کی آمدنی سے کچھ لینا پڑتا ہے جو دوسروں کی محنت سے حاصل ہوتی ہے ـ تو کیا اسے بھی گدا کہا جائے گا!

آپ ان سربراہانِ مملکت کی زندگی کو سامنے لائیے اور پھر خود فیصلہ کیجئے کہ انہیں کیا کہا جائے گا؟

خلیفہ کا وظیفہ

حضرت ابوبکر صدیقؓ، منصبِ خلافت پر سرفراز ہونے سے پہلے، کپڑے کا کاروبار کرتے تھے اور خاصے مرفہ الحال تھے ـ خلیفہ منتخب ہونے کے دوسرے دن حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ وہ کپڑے کا گٹھا اٹھائے، بازار کی طرف جارہے ہیں ـ انہوں نے پوچھا کہ آپ کدھر جارہے

ہیں ؟ جواب دیا کہ اپنے کام پر۔ انہوں نے کہا کہ خلافت کی ذمہ داریاں قبول کر لینے کے بعد، آپ کا وقت آپ کا نہیں رہا، ملّت کا ہو گیا ہے۔ اس لئے آپ اسے ذاتی کام کے لئے صرف نہیں کر سکتے۔ انہوں نے کہا کہ ایسا نہ کروں گا تو کھاؤں گا کہاں سے ؟ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اس کا انتظام کرنا اُمّت کے ذمّے ہے۔ چنانچہ سوال درپیش ہوا کہ خلیفہ کا وظیفہ، یعنی حق الخدمت کیا ہونا چاہیئے۔ بعض روایات میں ہے کہ آپ نے کہا کہ اسے میں خود اپنے لئے مقرر کروں گا۔ چنانچہ آپ نے معلوم کیا کہ مدینہ میں ایک مزدور کی یومیہ اُجرت کیا ہے ! اس کے مطابق آپ نے اپنا وظیفہ مقرر کیا۔ دوسری روایات میں ہے کہ اسے دیگر صحابہؓ نے مقرّر کیا تھا۔ اور معیار تھا قریش کے معمولی فرد کا اندازِ زندگی۔ کچھ بھی تھا۔ جب آپ کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ نے اپنے اعزا سے کہا کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ میں نے مسلمانوں کے بیت المال سے...... ہے اس کے مطابق ان کی خدمت بھی کر سکا ہوں یا نہیں۔ اس کے متعلق قیامت میں بازپرس ہو گی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کا حساب یہیں چکا دیا جائے۔ ایک مختصر سا قطعہ زمین میرے پاس ہے۔ اسے فروخت کر دیا جائے اور جس قدر رقم میں نے بیت المال سے لی ہے اسے واپس کر دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

حضرت عمرؓ نے اپنے لئے جو وظیفہ مقرر کیا، وہ یہ تھا :-

کپڑوں کے دو جوڑے، ایک سردی کا ایک گرمی کا۔ حج اور عمرہ کے لئے ایک احرام۔ اور میرے اور میرے اہل و عیال کے لئے نی کس اتنا کھانا جو قریش کے ایک آدمی کی خوراک ہے۔ نہ اس سے زیادہ، نہ اس سے کم۔ اس کے بعد میں مسلمانوں کا ایک فرد ہوں جو ان کا حال سو میرا حال۔

اس اُجرت کے عوض کام کتنا ؟ بائیس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی مملکت کا نظم و نسق۔ ذمہ داری کے احساس کا یہ عالم...... کہ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضرت عمرؓ پالان پر سوار تیز تیز جا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا، امیر المؤمنین ! کدھر ؟ کہنے لگے، بیت المال کا ایک اونٹ گم ہو گیا ہے اسے ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔ حضرت علیؓ نے کہا۔ آپ نے کسی اور سے کیوں نہ کہہ دیا کہ وہ اس اونٹ کو تلاش کرے۔ آپ نے کہا کہ بخدا ! یہ تو اونٹ ہے۔ اگر بیت المال کی ایک بکری بھی کہیں گم ہو گئی تو عمرؓ سے اس کی بھی بازپرس ہو گی !

امیر المؤمنین، دن بھر اس قسم کے فرائض سرانجام دیتے تھے، اور راتوں کو گشت کرتے تھے تاکہ رعایا کا حال براہِ راست معلوم کیا جائے اور ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے میں توقف یا تاخیر نہ ہو۔ یہ اسی قسم کی گشت کا واقعہ ہے کہ آپ نے دیکھا کہ ایک خیمہ میں ایک عورت کچھ پکا رہی ہے۔ اور دو تین بچے پاس بیٹھے رو رہے ہیں۔ آپ کے استفسار پر اس نے کہا کہ کئی وقت سے بچوں کو کچھ کھانے کو نہیں ملا۔ میں نے خالی ہنڈیا میں پانی ڈال کر چولھے پر چڑھا رکھا ہے کہ بچوں کا دل بہلا رہے۔ حضرت عمرؓ اٹھے۔ بیت المال سے آٹا، گھی، کھجوریں لیں اور اپنے خادم، اسلمؓ سے کہا کہ انہیں میری پیٹھ پر لاد دو۔

اسلم نے کہا کہ مجھے دے دیجئے۔ میں لئے جاتا ہوں۔ فرمایا۔ اسلم! اس معاملہ کا تعلق قیامت سے ہے۔ اور قیامت میں تم میرا بوجھ نہیں اٹھاؤ گے۔ اس لئے یہ بوجھ مجھے خود ہی اٹھا کر لے جانے دو۔ (شاہکارِ رسالت صفحہ ۲۹۳)

"اس معاملہ کا تعلق قیامت سے ہے اور قیامت میں ہر ایک کو اپنا اپنا بوجھ آپ اٹھانا پڑے گا"۔

یہ تھیں وہ خدمات جو یہ سربراہانِ مملکت سرانجام دیتے تھے۔ ان خدمات کی اجرت ہیں جو کھانا منظور کرایا تھا، اس کی نوعیت یہ تھی کہ ایک دن مصر کا گورنر ملنے کے لئے آیا تو آپ کھانا کھا رہے تھے۔ کھانے میں جو کی روٹی، زیتون کا تیل اور موٹا پسا ہوا نمک تھا۔ اس نے کہا کہ امیر المومنین! آپ گیہوں کے آٹے کی روٹی کیوں نہیں کھاتے؟ آپؓ نے کہا کہ تم بتاؤ کہ کیا اس وقت ہماری مملکت میں ہر شخص کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے؟ اس نے کہا کہ ایسا تو میں نہیں کہہ سکتا! اس پر آپؓ نے فرمایا:۔

عمرؓ کو اس وقت اس کا یقین ہے کہ مملکت میں ہر شخص کو کم از کم جو کی روٹی مل رہی ہے۔ وہ گیہوں کی روٹی اس دن کھائے گا جب اسے اس کا اطمینان ہو جائے گا کہ ہر شخص کو گیہوں کی روٹی میسر آ رہی ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ جو کچھ رعایا سے لیا جا رہا ہے اس کے عوض میں خدمات کس قدر انجام دی جا رہی ہیں۔ کیا کسی کو ایسے کاموں کے لئے اتنا سستا مزدور مل سکتا تھا؟ سستا بھی اور پھر امین بھی! خدمت کے

خدمت کے بغیر کچھ نہیں

بغیر کچھ لینا تو ایک طرف وہ تو خدمت کے بغیر مملکت کے لئے بھی کچھ لینا جائز نہیں سمجھتے تھے! اس ضمن میں ایک آزاد شدہ غلام (سعید) کا بیان کردہ واقعہ بڑا بصیرت افروز ہے۔ ان کا بیان ہے کہ میں آزادی حاصل ہونے کے بعد، حکومت کے واجبات کی رقم ادا کرنے کے لئے حضرت عمرؓ کے پاس آیا تو آپ نے پوچھا کہ کیا تم نے حکومت کے بیت المال سے کچھ فائدہ بھی اٹھایا ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں! ابھی تک تو میں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس پر آپ نے فرمایا۔ کہ پھر اپنی رقم واپس لے جاؤ۔ جب تمہیں حکومت کی طرف سے کچھ مل جائے تو پھر اسے لانا۔ (شاہکارِ رسالت صفحہ ۳۶۸)

آپ نے دیکھا کہ سربراہِ مملکت تو ایک طرف، وہاں خود مملکت بھی نہ گداگر ہوتی تھی، نہ قزاق۔ وہ حق الخدمت لیتی تھی۔ اور یہ نہ محتاجی ہوتی ہے نہ گداگری!

نہ محتاج نہ ذلیل

اور جب اس مملکت میں کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوتا، تو کوئی ذلیل بھی نہیں ہوتا۔ وہ مملکت، احترامِ آدمیت کی زبانی دعویدار نہیں تھی۔ عملاً بھی اس کا مظاہرہ کرتی تھی۔ ایک دفعہ حمص کے حاکم، حضرت عمیر بن سعدؓ کے منہ سے ایک غیر مسلم (ذمی) کے متعلق یہ الفاظ نکل گئے ــــ اخزک اللہ، خدا تجھے ذلیل کرے! سہواً یہ الفاظ تو زبان سے نکل گئے، اس کے بعد اس قدر ندامت اور تاسف ہوا کہ بابِ خلافت میں آ کر استعفےٰ دے دیا کہ میں اس منصب کا اہل نہیں۔ جو احترامِ آدمیت نہیں کر سکتا وہ خود بھی کسی عزت و احترام کا مستحق نہیں۔

یہ تھے وہ حکمران جو نہ گداگر تھے، نہ قزاق۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

آں مسلماناں کہ میری کردہ اند — در شاہنشاہی، فقیری کردہ اند

اور یہ تھی وہ مملکت جو اس بنیاد پر قائم ہوئی تھی کہ ؎

کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس — نکتۂ شرعِ مبیں، این است و بس

وہ جانتے تھے کہ اسلامی نظام کسے کہتے ہیں، اور شریعتِ حقہ کا مقصود و منتہیٰ کیا ہے۔

(۰)

عزیزانِ من! وقت تھوڑا ہے اور داستان دراز۔ اس لئے مجھے اختصار سے کام لینا ہے۔

ابھی تک ہم محنت کشوں کی محتاجی کا ذکر کر رہے تھے۔ اس کا اگلا گوشہ، مالکانِ زمین اور مزارعین کی کشمکش ہے۔ اس باب میں قرآنِ مجید کا فیصلہ یہ ہے کہ زمین، تمام نوعِ انسان (بلکہ تمام ذی حیات) کے لئے سرچشمۂ رزق ہے۔ اس لئے اس پر کسی کی ذاتی ملکیت ہو نہیں سکتی۔ اور جب کوئی شخص زمین کا مالک نہیں ہو سکتا تو، مالکِ اراضی اور مزارع کی کش مکش کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ قرآنِ مجید میں بھی اس موضوع پر بڑی تفصیل سے آیا ہے اور علامہ اقبالؒ نے بھی اس پر شرح و بسط سے لکھا ہے۔ (تفصیل اس کی میری کتاب، نظامِ ربوبیت میں ملے گی) میں یہاں اس کے صرف ایک مقام پر اکتفا کروں گا۔ سورۂ واقعہ کی چند آیات میں قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو بڑے دلکش انداز سے بیان کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ

تم ذرا اس نظام پر غور کرو جس کے مطابق تمہاری پرورش اور نشوونما ہوتی ہے اور سوچو کہ یہ سب کچھ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے یا تمہارے کسب و ہنر کے مطابق۔ مثلاً تم جو کھیتی باڑی کرتے ہو تو غور کرو کہ اس میں تمہارا عمل دخل کتنا ہوتا ہے اور ہمارا قانون کیا کچھ کرتا ہے؟ تم زمین میں ہل چلا کر اس میں بیج ڈال دیتے ہو۔ اب بتاؤ کہ اس بیج سے فصل کون اگاتا ہے؟ کیا ایسا تم کرتے ہو یا ہمارے قانون کی رو سے ہوتا ہے۔ أَفَرَأَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ۝ أَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ ۝ (۵۶/۶۳-۶۴)

اس کے بعد کہا کہ تم اس پانی پر غور کرو جس پر تمہاری کھیتی ہی کا نہیں، خود تمہاری زندگی کا دار و مدار ہے۔ کیا اسے بادلوں سے تم برساتے ہو یا ہمارا قانونِ ربوبیت ایسا کرتا ہے: أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ ۝ أَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنزِلُونَ ۝ (۵۶/۶۸-۶۹)

اس کے بعد کہا کہ... تم اس آگ (حرارت) پر غور کرو جس سے تم اتنے کام لیتے ہو۔ کہو کہ سبز درختوں کی شاخوں میں حرارت کو یوں مستور کر دینا تمہاری کاریگری ہے یا ہمارا قانون ایسا کرتا ہے۔ أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ ۝ أَأَنتُمْ أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنشِئُونَ ۝ (۵۶/۷۱-۷۲)

ان حقائق کے بیان کرنے کے بعد کہا کہ رزق پیدا کرنے کی اس تمام کائناتی مشینری پر غور کرو اور سوچو کہ یہ کس کے قانون کی کارفرمائی ہے۔ پھر اس پر بھی غور کرو کہ اس میں تمہارا حصہ کس قدر ہے اور نظامِ خداوندی کا کس قدر! تم کسی نہج سے بھی غور کرو۔ بہرحال، اسی نتیجہ پر پہنچو گے کہ اس کاروبار میں تم صرف محنت کرتے ہو۔ باقی سب کچھ خدا کا نظام کرتا ہے۔ لہٰذا، اس ماحصل میں تمہارا حصہ صرف تمہاری

محنت کے بقدر ہو سکتا ہے۔ تم پورے کے پورے کے مالک نہیں بن سکتے۔ تم اپنی محنت کا معاوضہ اپنے سامانِ پرورش کی صورت میں اپنے پاس رکھ لو۔ اور ہمارا حصہ ۔۔۔ ہمیں دے دو۔ سوال پیدا ہوا کہ آپ کا حصہ آپ تک کیسے پہنچائیں؟ جواب دیا: مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ (۵۶/۷۳) یہ انہیں دے دو جو اپنا رزق پیدا کرنے سے معذور ہیں۔ ان تک پہنچ گیا تو سمجھ لو کہ ہم تک پہنچ گیا۔

علامہ اقبالؒ نے اس پورے تذکرہ کو بالِ جبریل کی اس نظم میں بڑی برجستگی سے بیان کیا ہے جس کا عنوان ہے:۔

اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ!

اور نظم یہ ہے:۔

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟ — کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟ — خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟ — موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟
دِہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں!
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں! (بالِ جبریل ص۱۶۱)

جب زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت ہو نہیں سکتی تو کسی مزارع کو زمین، بٹائی یا ٹھیکہ پر دینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

ابوداؤدؒ میں حضرت ابن ابی نعیم کی روایت ہے کہ

> رافع بن خدیجؓ نے ایک زمین کاشت پر لی۔ وہ اسے پانی دے رہے تھے کہ حضورؐ کا گذر اس طرف سے ہوا۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ یہ زمین کس کی ہے اور کھیتی کس کی؟ رافعؓ نے کہا کہ یہ کھیتی میرے بیج اور میری محنت کا نتیجہ ہے۔ اس کا ایک حصہ میرا ہوگا اور ایک حصہ فلاں خاندان کا جس کی یہ زمین ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ تم دونوں سودی کاروبار کر رہے ہو۔ زمین صاحبِ زمین کو واپس کر دو اور اپنا خرچہ اس سے وصول کر لو۔ (شاہکارِ رسالت۔ ص۳۸۲)

جب زمین پر کسی کی ملکیت ہی جائز نہیں، تو کوئی شخص نہ زمیندار ہو سکتا ہے، نہ اس کا کوئی مزارع۔ لہٰذا نہ وہ اس کا محتاج ہوگا، نہ یہ۔ کس نگردد در جہاں محتاجِ کس۔

---(۰)---

اور آخر میں ہمارے سامنے وہ گوشہ آتا ہے جو ان تمام خباثت اور مفاسد کی جڑ اور بنیاد ہے۔ یعنی نظامِ سرمایہ داری! قرآنِ کریم نے معاشی نظام کا بنیادی اصول یہ بتایا ہے کہ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (۵۳/۳۹) معاوضہ صرف محنت کا ہے۔ اس کے برعکس، نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد اس پر ہے کہ معاوضہ سرمایہ کا ہے۔ یعنی ایک شخص سرمایہ لگاتا ہے، اور دوسرے لوگ محنت کرتے ہیں، خواہ اس کی شکل انڈسٹری (کارخانہ داری) کی ہو، اور خواہ کامرس (تجارت) کی۔ یہ شخص ان محنت کشوں کی محنت کے ماحصل میں سے معتدبہ حصہ لے جاتا ہے اور اسے اپنے سرمایہ کا معاوضہ کہتا ہے۔ قرآنِ کریم اسے ربوٰ کہہ کر پکارتا ہے، اور نہ صرف اسے حرام کہتا ہے بلکہ اسلامی مملکت کے خلاف

بغاوت قرار دیتا ہے۔ سرمایہ، دولت جمع کرنے کا نام ہے اور قرآن کریم دولت جمع کرنے کو جرمِ عظیم اور عذابِ جہنم کا مستوجب ٹھہراتا ہے۔ قرآنِ مجید کی بکثرت آیات اسی موضوع پر ہیں۔ میں اس وقت صرف ایک آیت پر اکتفا کرتا ہوں۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ (9/34-35)

جو لوگ چاندی سونا (مال و دولت) جمع کرتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے کھلا نہیں رکھتے۔ اے رسول! تو انہیں الم انگیز عذاب کی "بشارت" سنا دے (یہ عذاب اس دن واقعہ ہوگا) جب سونے چاندی کے ان جمع کردہ سکّوں کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا اور ان سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھ کو داغا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہ دولت ہے جسے تم نے اپنے مفاد کے لئے جمع کر رکھا تھا، سو اب اس جمع شدہ دولت کے لائے ہوئے عذاب کا مزہ چکھو۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، قرآنِ مجید میں اکتنازِ دولت کے خلاف اس قدر آیات ہیں کہ ان کی روشنی میں اس حقیقت کے سمجھنے میں ذرا بھی دقت پیش نہیں آتی کہ قرآن کریم نظامِ سرمایہ داری کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ اگرچہ مجھے اس کے بعد عنانِ گفتگو اقبالؒ کی طرف موڑ دینی چاہیے لیکن یہاں ایک ایسا سوال میرے سامنے آتا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ آپ کے دل میں بھی ابھر رہا ہوگا، جس سے صرفِ نظر کر کے آگے بڑھا نہیں جا سکتا۔ اور وہ سوال یہ ہے کہ دولت جمع کرنے کے دیگر عنوانات کو چھوڑیئے، زکوٰۃ کو اسلام کا ایک ستون قرار دیا جاتا ہے۔ اور زکوٰۃ بہر حال جمع شدہ دولت پر ہی ادا کی جاتی ہے اگر اسلام میں دولت جمع کرنا اس قدر ممنوع ہے تو پھر زکوٰۃ ادا کرنے کا سوال کس طرح پیدا ہوگا۔ میں سردست اس موضوع کی طرف نہیں آنا چاہتا کہ قرآنِ کریم کی رُو سے زکوٰۃ کا مفہوم کیا ہے، اور اس مفہوم کی رُو سے اکتنازِ دولت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ میں صرف اس قدر بتانا چاہتا ہوں کہ، آیہ زیرِ نظر کی موجودگی میں زکوٰۃ کس طرح فرض ہوئی؟ ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ

(حضرت) ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی (وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ...) تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر ہوا یعنی انہوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا[1] حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری اس فکر کو دُور کر دوں گا اور اس مشکل کو حل کر دوں گا۔ پس عمرؓ رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ یا نبی اللہ! یہ آیت آپ کے صحابہؓ پر گراں گذری ہے۔ آپ نے فرمایا کہ

---

[1] خدا کا حکم، رسول اللہؐ کی زبانِ مبارک سے، اور صحابہؓ پر گراں گذرے! (معاذ اللہ)

خداوند تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے..... ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا یہ بیان سُن کر عمرؓ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کہا.....

(ابوداؤد۔ بحوالہ مشکوٰۃ۔ کتاب الزکوٰۃ)

اس سے واضح ہے کہ ہماری مروّجہ زکوٰۃ کو (یعنی جمع شدہ مال پر سال کے بعد، اڑھائی فی صد دے دینا) قرآن نے فرض نہیں قرار دیا۔ وضعی روایات کی رُو سے ایسا ہوا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ وہ نظام سرمایہ داری جسے ختم کرنے کے لئے اسلام آیا تھا، عین مطابقِ اسلام قرار پا گیا۔ چنانچہ سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) اپنی کتاب "مسئلہ ملکیتِ زمین" میں لکھتے ہیں:-

اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور ملکیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی..... جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت، جبکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں، بلا حد و نہایت رکھی جا سکتی ہیں۔ روپیہ، پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء، مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں۔ (پہلا ایڈیشن صفحہ ۵۱) پھر جس طرح اسلام ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں، اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو۔ اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو..... نیز وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بس وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے۔ اور یہ کہ اُجرت یا شرکت پر کاشت کرانے والوں کو سرے سے حقوقِ ملکیت ہی حاصل نہیں۔ (صفحہ ۵۲)

اس سے نظامِ سرمایہ داری کے دروازے چوپٹ کھل گئے اور مزارعت (بٹائی یا پٹہ پر زمین کاشت کرانا) اور مضاربت (SLEEPING PARTNERSHIP) سب جائز قرار پا گئے۔ اقبالؒ نے اس کے خلاف مسلسل جہاد جاری رکھا۔

نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) ہے۔ قرآن کریم نے اس کا راستہ ہی بند کر دیا۔ سورۂ بقرہ میں ہے: يَسْـَٔلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ ط..... "اے رسولؐ! یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دیں؟..... قُلِ الْعَفْوَ ط..... ه (۲/۲۱۹) فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضرورت سے زائد ہے، وہ سب!"

ہماری ملوکیت نے ان..... آیات کو یا تو منسوخ قرار دے رکھا تھا اور یا محض تلاوت کے لئے برقرار۔ ان کا حکم بہرحال منسوخ سمجھا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ کہ اس اُمّت میں بھی نظام سرمایہ داری رائج رہا اور باقی دنیا بھی قرآنی نظام کی برکات سے محروم رہی۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، اگر کوئی جماعت، قرآنی نظام کو قائم کرنے کے لئے نہیں اٹھتی، تو کائناتی قوتیں یا زمانے کے تقاضے، انسانوں کو اس کی طرف آنے کے لئے مجبور کر دیتے ہیں۔ روس کا انقلاب انہی تقاضوں کا نتیجہ تھا۔ اس میں فاضلہ دولت کے نظریہ کو شدت سے مسترد

کیا گیا تھا۔ اقبالؒ نے اسی کے پیشِ نظر کہا تھا کہ :ـ

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم ۔۔۔ بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ گفتار
انسان کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر ۔۔۔ کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں! ۔۔۔ اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار

جو حرفِ قُلِ الْعَفْوَ میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دَور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار!

ہمارے ہاں آجکل معاشرہ کے ہر جزو اور کُل کو "مسلمان کرنے" کا جنون اعصاب پر سوار ہے۔ معاشیات

ربوٰا

اس کا خاص طور پر ہدف ہے۔ اس سلسلہ میں سود کے مسئلہ پر بڑی طول و طویل بحثیں ہو رہی ہیں۔ پانچ پانچ سو صفحات پر مشتمل تصانیف شائع ہوتی ہیں۔ یہ کچھ اس مسئلہ کے متعلق ہو رہا ہے جسے قرآن کریم نے دو لفظوں میں حل کر کے رکھ دیا ہے۔ اسلامی نظام قائم ہونے سے پہلے، عربی معاشرہ میں ربوٰ کا کاروبار عام تھا۔ جب قرآنِ مجید نے ربوٰ کو حرام قرار دیا اور مملکت کے خلاف بغاوت، تو سابقہ کاروبار کے سلسلہ میں فرمایا: فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ ۔۔۔۔ تم صرف اپنا اصل زر لے سکتے ہو۔ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ٥ (۲/۲۷۹) اس سے نہ تو تم پر کوئی زیادتی ہوگی کہ تمہیں تمہارا پیسہ واپس مل جائے گا۔ اس میں کچھ کمی نہیں ہوگی۔ اور فریقِ مقابل پر بھی کوئی ظلم و زیادتی نہیں ہوگی کہ اسے اصل سے کچھ زیادہ نہیں دینا پڑے گا۔ قرآن مجید کے ان چار لفظوں نے ساری بات واضح کر دی۔ جو کچھ رأس المال (اصل زر) سے زیادہ لیا جائے گا، وہ ربوٰ ہوگا، خواہ اس کی شکل نقدی قرضہ کی ہو۔ مزارعت کی ہو۔ مضاربت کی ہو۔ بینک کی ۔۔۔۔۔۔۔۔ اصطلاح "شرکتِ منافع" کی ہو۔ سب ربوٰ کے زمرہ میں آئے گا۔ آپ دیکھیں گے کہ سود پر پانچ سو صفحات پر مشتمل تصانیف میں، قرآن کریم کی اس آیت کو کبھی سامنے نہیں لایا جائے گا۔ جو کچھ لکھا جائے گا وہ اس حقیقت کا غماز ہوگا کہ ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں ۔۔۔ ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!

یہ تو تھا سابقہ سودی کاروبار کے متعلق حکم۔ اسلامی نظام معیشت میں "قُلِ الْعَفْوَ" نے سارا مسئلہ حل کر دیا۔ نہ کسی کے پاس فاضلہ دولت ہوگی، نہ اس پر کچھ زائد لینے کا سوال پیدا ہوگا۔ اور نہ ہی کسی کو کسی سے کچھ مانگ کر ذلیل ہونے کی ضرورت پڑے گی۔ اسلامی نظام ہر ایک کی ضروریات بطور اس کے حق کے پوری کرے گا۔

انقلابِ روس کے دعاوی میں اقبالؒ کو اسی "قُلِ الْعَفْوَ" کی جھلک دکھائی دی تھی جس سے اس کی خوش نظری نے اسے اس نتیجہ پر پہنچایا تھا کہ ؎

زمانے کے انداز بدلے گئے ۔۔۔ نیا راگ ہے، ساز بدلے گئے
پرانی سیاست گری خوار ہے ۔۔۔ زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے

گیا دورِ سرمایہ داری گیا!
تماشا دکھا کر مداری گیا!

(ضمناً) "مداری" کا لفظ یوں تو (بنظرِ بظاہر) "سرمایہ داری" کے قافیہ کے لئے لایا گیا ہے۔ لیکن اس میں ایک معنوی نکتہ بھی ہے۔ اب تو اس قسم کے مداری نہیں آتے۔ کچھ عرصہ پہلے جو مداری آتے تھے، وہ خالی ہاتھوں روپے پر روپیہ بناتے چلے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ روپیہ درحقیقت بنتا نہیں تھا بنظر ایسا آتا تھا کہ روپیہ بن رہا ہے۔ یہی کیفیت، نظامِ سرمایہ داری کی ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے: لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰٓوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ص...... (۳/۱۳۰) کہا یہ جاتا ہے کہ ربوٰ سے دولت بڑھتی ہے، یہ صحیح نہیں۔ اس سے قومی دولت بڑھتی نہیں، گھٹتی ہے۔ یہ جو دولت بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے، مداری کا "ہتھ ناٹک" ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اسی نظم میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ؎

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے!

حالانکہ یہ ۳۵-۱۹۳۴ء کی بات ہے، جب ہنوز خود چینیوں کو بھی اس کا احساس نہیں تھا کہ ان کی شبِ تیرہ و تار کی سحر قریب ہے۔ لیکن قرآنی بصیرت کی روشنی میں حال کے واقعات و حوادث کے تجربہ سے مستقبل کے متعلق اس قسم کی قیاس آرائی مشکل نہیں ہوتی۔ اسی بنا پر انہوں نے کہا تھا کہ ؎

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے

یہ روس اور چین کی بات تھی۔ کہتے ہیں کہ مور جنگل میں ناچتا ہے تو اپنے رقص کی نازک خرامیوں اور اپنے رنگین پروں کی جلوہ پاشیوں میں وہ ایسا کھو جاتا ہے کہ اسے ماحول تو ایک طرف، خود اپنے آپ کا بھی ہوش نہیں رہتا۔ لیکن اس کے بعد جب اس کی نگاہ اپنے پاؤں پر پڑتی ہے تو رقص ختم ہو جاتا ہے۔ پر سمٹ جاتے ہیں۔ اور وہ نہایت پژمردگی کے عالم میں نگوں سار ہو جاتا ہے۔

حضرتِ علامہؒ ــــــ زمانے کے انداز بدلے گئے نیا راگ ہے، ساز بدلے گئے ــــــ کی وجد آفرینیوں میں محو تھے کہ ان کی نگاہ ملتِ اسلامیہ پر پڑی۔ کیف و مستی کا وہ عالم، رقصِ طاؤس کی طرح مرجھا گیا۔ اور انتہائی سوز و گداز سے پکار اُٹھے کہ ؎

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش
مگر دل ابھی تک ہے زنّار پوش!

تمدّن، تصوّف، شریعت، کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام!

حقیقت خرافات میں کھو گئی!
یہ اُمّت روایات میں کھو گئی

لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب
مگر لذّتِ شوق سے بے نصیب

بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا
لغت کے بکھیڑوں میں اُلجھا ہوا

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد
محبت میں یکتا حمیت میں فرد

عجم کے خیالات میں کھو گیا!
یہ سالک مقامات میں کھو گیا

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے!
مسلماں نہیں خاک کا ڈھیر ہے! (بال جبریل صفحہ ۱۶۸)

مشیرانِ ابلیس کی زبان میں :-

ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجود   ان کی فطرت کا تقاضا ہے نمازِ بے قیام!
آرزو اول تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں   ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام
یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج   صوفی و مُلّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام
ہے طوافِ حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا   کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام (ارمغانِ حجاز)

اور خود ابلیس کے الفاظ میں :-

جانتا ہوں میں یہ اُمّت حاملِ قرآں نہیں   ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں   بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں (")

ایسے یاس انگیز حالات میں بڑے بڑے اربابِ عزم کے سینوں میں بھی امید کی کرن بجھ کر رہ جاتی ہے، لیکن اقبالؒ تو کسی اور ہی مٹی کا بنا ہوا تھا۔ اس کا ایمان اور پیغام یہ تھا کہ :-

مسلم استی! سینہ را از آرزو آباد دار   ہر زماں پیشِ نظر، لایخلف المیعاد دار

وہ قوم کے بڑے بوڑھوں سے ناامید ہوا تو اپنی توجہ کا مرکز آنے والی نسل کے نوجوانوں کو قرار دے دیا۔ وہ خدا سے پورے عجز و الحاج کے ساتھ دعائیں مانگتے تھے کہ :-

من کہ نومیدم ز پیرانِ کہن!   دارم از روزے کہ می آید، سخن
بر جواناں سہل کن حرفِ مرا   بہرِ شاں پایاب کن ژرفِ مرا

اور :-

جوانوں کو میری آہِ سحر دے   پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا! آرزو میری یہی ہے   مرا نورِ بصیرت عام کر دے

اور بالِ جبریل (کے ساقی نامہ) کی اسی نظم میں، جو ابھی فردوسِ گوش بن رہی تھی، کہا کہ :-

خرد کو غلامی سے آزاد کر!   جوانوں کو پیروں کا استاد کر!

اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت حالات اس زمانے سے بھی کہیں زیادہ مایوس کن ہیں، جب علامہؒ، پیرانِ کہن سے ناامید ہوئے تھے، لیکن میں ان کی یاد میں اس تقریب کو افسردہ نہیں کرنا چاہتا۔ میں اپنا اختتام ان کی اس دعا پر کرنا چاہتا ہوں جو آن کے دل کی گہرائیوں سے ابھری تھی۔ یعنی :-

ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر!   زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر!
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے   مرا عشق، میری نظر بخش دے
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں!   مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں!
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز!   مری خلوت و انجمن کا گداز!

امنگیں مری، آرزوئیں مری! امیدیں مری، جستجوئیں مری!
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر! اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر!
مرے قافلے میں لٹا دے اسے!
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے!

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمِ

—(۰)—

ایک سوال

میرا خطاب تو ختم ہوا، لیکن ایک سوال ہے جو مجھ سے ایک عرصہ سے پوچھا جا رہا ہے، اور میں اسے اب تک ٹالتا چلا آیا ہوں۔ لیکن اب اس کے تقاضے اس قدر شدید ہو گئے ہیں کہ مجھے (بادلِ ناخواستہ) اسے سامنے لانا پڑ رہا ہے۔ سوال کے الفاظ کچھ اس قسم کے ہیں کہ "ہم برسوں سے آپ کے درس میں بھی اور دیگر تقاریب میں بھی آپ کی زبانی پیغامِ اقبالؒ سنتے چلے آ رہے ہیں، اور آپ کی تحریروں میں پڑھتے بھی ہیں۔ آپ کو جس قدر اقبالؒ پر عبور ہے اور اسے آپ جس انداز سے قرآنِ مجید کی روشنی میں پیش کرتے ہیں، اس کی مثال نہیں ملتی۔ ملک میں علامہ اقبالؒ سے متعلق اتنی تقاریب منعقد ہوتی ہیں۔ آپ ان میں کیوں شریک نہیں ہوتے تاکہ اس پیغام کا دائرہ وسیع ہو"

جواب:- اس سوال کا دو لفظوں میں جواب یہ ہے کہ ان تقاریب میں وہی شریک ہو سکتا ہے جسے شرکت کی دعوت دی جائے۔ مجھے دعوت نہیں دی جاتی..... اس لئے میں ان میں شریک نہیں ہوتا۔

لیکن اس پر مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ یہ لوگ آپ کو دعوت کیوں نہیں دیتے؟ اس کا پھر دو لفظی جواب یہ ہے کہ یہ ان حضرات سے پوچھئے کہ وہ مجھے دعوت کیوں نہیں دیتے؟ لیکن چونکہ اس سے بھی مستفسرین کا اطمینان نہیں ہوگا اس لئے جو کچھ میں سمجھتا ہوں اسے عرضِ خدمت کر دینا چاہتا ہوں۔ میرے خیال میں یہ حضرات مجھے اس لئے نہیں بلاتے کہ میں بالواسطہ یا بلاواسطہ قرآنِ کریم پیش کرتا ہوں (خواہ اس کا واسطہ کلامِ اقبالؒ ہو یا پیغامِ قائدِ اعظمؒ) اور قرآن ہماری قوم کے مزاج کے موافق نہیں۔ اس لئے ان کی کوشش یہی رہتی ہے کہ اس کی آواز عام نہ ہونے پائے۔ مجھے اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ میرے ہاں اپنے ذرائع ابلاغ موجود ہیں۔ لیکن اس سے جس طرح قوم اقبالؒ کی قرآنی فکر سے محروم رہ جاتی ہے اس کا افسوس ضرور ہوتا ہے۔ اقبالؒ سے متعلق تقاریب ہوں یا قائدِ اعظمؒ سے متعلق، انہیں محض رسمی طور پر منایا جاتا ہے۔ اور یہ بھی اس وقت تک کیا جائے گا جب تک اس سے کچھ مفاد حاصل ہوتے ہوں۔ اس کے بعد فقط تاریخ کی کتابوں میں ان کے نام رہ جائیں گے۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ داتا گنج بخش (علیہ الرحمۃ) کا عرس تو اس قدر دھوم دھام سے منایا جاتا ہے لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضؓ یا حضرت عمر فاروق رضؓ کے متعلق اتنا بھی بہت

کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ان کی تاریخ وفات (یا شہادت) کونسی ہے! دو ایک سال اُدھر سے، یومِ صدیقؓ اور یومِ فاروقؓ کی آوازیں تو سنائی دینے لگی ہیں لیکن بڑی مدھم سی۔ آپ کو معلوم ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ داتا صاحب (علیہ الرحمتہ) کی تقاریب کے سلسلہ میں لاکھوں روپے کی یافت ہوتی ہے اور صدیق اکبرؓ اور عمر فاروقؓ کی یاد منانے میں (کچھ ملنا تو ایک طرف) گرہ سے خرچ کرنا پڑتا ہے یا چندہ جمع کرنا۔ اگر اقبالؒ کی تقاریب کے سلسلہ میں بھی یہ صورت پیدا ہوگئی تو اس کی آواز صرف قوالوں کی ڈھولک کی تھاپ پر سنائی دیا کرے گی کہ "طبع مشرق کے لئے موزوں یہی افیون ہے"۔

ہماری قوم کی انتہائی کوشش یہ ہے کہ —— ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں —— اور قرآنِ کریم کو تلاوت تک، اور اقبالؒ کو شاعری تک محدود (بلکہ محبوس) رکھنے سے بھی مقصد یہی ہے۔ اور اس میں اسے خاصی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ قوم کی اسی ذہنیت کے پیشِ نظر، علامہؒ نے کہا تھا کہ ؎

اقبالؒ یہاں نام نہ لے علمِ خودی کا! موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات

بہتر ہے کہ بیچارے ممولوں کی نظر سے پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات!

"ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں آخری ریزولیشن یہ پاس ہوا تھا کہ ؎

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے پختہ تر کردو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اقبالؒ سے متعلق تقاریب بھی اسی مقصد کے حصول کا ذریعہ بن کر رہ گئی ہیں۔ اس نے سچ کہا تھا کہ ؎

وہی میری کم نصیبی، وہی تیری بے نیازی میرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ نَے نوازی!

یہ اس لئے کہ ؎

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی!

نتیجہ اس کا یہ کہ ؎

کوئی کارواں سے ٹوٹا، کوئی بدگماں حرم سے کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دلنوازی!

اور، یہ

علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی!

والسلام